وقار راشدی

اقبال کا نظریۂ زندگی

علامہ اقبال شاعرِ حیات ہیں۔ ان کا سارا کلام قرآن حکیم اور حدیث کا ترجمان ہے۔ ان کے اشعار محض سننے اور سر دھننے کے لیے نہیں بلکہ بار بار پڑھنے اور سمجھنے کے لیے ہیں۔ اقبال وہ شاعرِ ملت ہیں جنھوں نے اپنے افکارِ جمیل کو اسلامی تعلیمات اور زندگی آمیز و زندگی آموز پیغامات کے لیے وقف کیا۔ اقبال نے ہمیں "یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم" کے ساتھ ساتھ "جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی" کی حقیقتوں سے روشناس کیا۔ کائنات فطرت کے ذرّے ذرّے میں زندگی کا جو راز پوشیدہ ہے اُسے انھوں نے آشکارا کیا:

زندگی قطرے کو سکھلاتی ہے اسرارِ حیات　　یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

اقبال نے شاعرانہ الفاظ اور فلسفیانہ انداز میں خدا اور کائنات سے لے کر خودی و خود شناسی تک کے تمام راز بیان کیے۔ حیات اور کائنات کیا ہیں؟ بزمِ قدرت اور مناظرِ فطرت کیا ہیں؟ خالق و مخلوق، عابد و معبود، ساجد و مسجود کا رشتہ کیا ہے؟ ان تمام حقائق و معارف کو اقبال نے اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔

ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے ایک مکتوب میں علامہ تحریر فرماتے ہیں:

"حیات تمام و کمال انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر موجود میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ایسی کوئی شے موجود نہیں جسے حیاتِ کُلّی کہہ سکیں۔ خود خدا بھی ایک فرد ہے لیکن ایسا فرد جس کا عدیل و نظیر نہیں۔ کائنات افراد کے مجموعے کا نام ہے مگر اس مجموعے میں جو نظم و ترتیب ہم دیکھتے ہیں وہ کامل و دائم نہیں۔ ہمارا قدم تدریجی طور پر بے نظمی اور انتشار سے نظم و ترتیب کی طرف بڑھ رہا ہے اور کائنات مراتبِ تکمیل طے کر رہی ہے۔"

قدرت کے یہ جلوے اور فطرت کی یہ رنگینیاں اور رعنائیاں جو ہمارے گرد و پیش ہیں کائنات کی تخلیق و تدوین کی مظہر ہیں۔ انسانی قدروں کا انحصار بزمِ دنیا کے حسن و کمال پر ہے۔ منتہائے کمال پر پہنچنے کے لیے اپنی زندگی کو فنا کرنا اور خدا کی ذات میں جذب ہو جانا عین حیات ہے۔ یہی مقصودِ تخلیقِ کائنات ہے۔ اس کا تعلق انفرادیت سے بھی ہے، اجتماعیت سے بھی۔ حیات سے فرد ہے، فرد سے پوری کائنات ارتقا پذیر ہے لیکن تسخیرِ کائنات خودی کے بغیر ممکن نہیں۔ انا یا خودی، وہ طاقت ہے جو خودی کو مخلوق سے اور مخلوق کو حیات سے ملا دیتی ہے۔

اقبال کے نزدیک خودی کے بغیر زندگی حُسن یعنی کمال سے بیگانہ رہتی ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جو انسان کو معراجِ حیات تک پہنچاتا ہے۔ اقبال کی نظر میں خودی کی حفاظت اور خودی کی تعمیر سے خود شناسی اور خدا شناسی کے سربستہ راز منکشف ہوتے ہیں:

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا ــــ خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے ــــ نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

خودی میں ڈوب کر ہی زندگی کا سراغ مل سکتا ہے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی ــــ تو اگر میرا نہیں بنتا تو نہ بن اپنا تو بن

حقیقت یہ ہے کہ اپنے من میں ڈوب کر ہی انسان کا حریمِ وجود خودی سے روشن ہے۔ حیات کا سفر سوز و سازِ خودی کی لے سے بیدار و بے تاب رہتا ہے:

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود ــــ حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و ثبات

خودی میں ڈوبنے سے اقبال کی کیا مراد ہے؟ اس فلسفہ کی صراحت "جاوید نامہ" اور "مثنوی پس چہ باید کرد" میں موجود ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خودی ایک فن ہے اور یہ فن اہلِ فن کی صحبت سے حاصل ہو سکتا ہے مراد یہ ہے کہ منزل تک پہنچنے کے لیے کسی مرشدِ کامل کی رہنمائی ضروری ہے۔ صرف کتابوں کا علم کافی نہیں تکمیلِ حیات کے لیے بزرگوں اور اللہ والوں کی صحبت مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال "مثنوی پس چہ باید کرد" میں ایک جگہ کہتے ہیں:

صحبت از علم کتابی، خوشتر است ــــ صحبتِ مردانِ حُر، آدم گر است

اقبال کے نزدیک خودی کی تشکیل اور حسن کا نکھار عشق کی سرمستی سے پیدا ہوتا ہے۔ "نفسِ گرم اور سوزِ دل" عشق کی شدت سے پروان چڑھتا ہے۔ یہ کائنات، یہ موجودات سب کچھ عشق کا کرشمہ ہے۔ بقائے دوام کے لیے عشق میں فنا ہونا حیات کی تکمیل ہے۔ عشق ہی وہ جذبہ ہے جس کی بدولت حیاتِ جاودانی نصیب ہوتی ہے۔ اور یہ عشق ہی ہے جو انسان کو حیات کی بلند ترین ارتقائی منزلوں تک پہنچاتا ہے:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ ــــ عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

عشق دمِ جبرائیل، عشق دلِ مصطفٰے ــــ عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات ــــ عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

اقبال کا کلام ہی قرآن و حدیث کی تفسیر نہیں بلکہ ان کا دل بھی ضیائے توحید اور نورِ محمدی سے منور تھا۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ فکر و عمل سے عبارت ہے۔ وہ زندگی جو اخلاقی قدروں سے بھرپور اور سادگی و صفائی، زہد و تقویٰ کی پاکیزگی

سے معمور تھی۔ خدمتِ اسلام اقبال کی زندگی کا نصب العین تھا۔ ان کا نظریۂ حیات اس نظم سے واضح ہوتا ہے جو انھوں نے سر عبدالقادر کے نام لکھی تھی۔ ان کی آرزوؤں کے نقوش ان اشعار میں دیکھیے:

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق — سنگِ امروز کو آئینہ فردا کر دیں
اس چمن کو سبقِ آئینِ نمو کا دے کر — قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
شمع کی طرح جییں بزم گہِ عالم میں — خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

سب جانتے ہیں کہ اقبال نے اپنی زندگی کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے آئینے میں ڈھال دیا تھا۔ ان کی زندگی شروع سے آخر تک مسلسل جدوجہد میں گزری۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ایک ایک بول میں رس ہے ایک ایک لفظ میں جادو ہے۔ اقبال کا پیغام سراسر پیغامِ حیات ہے۔ ان کے ایک ایک حرف میں زندگی کی حرارت ہے۔ انھوں نے نظم "چاند اور تارے" میں فلسفۂ حیات کو اجاگر کیا ہے۔ حرکت کو زندگی اور سکون کو موت قرار دیا ہے۔ یہ دنیا ایک رزم گاہ ہے۔ میدان کارزار ہے۔ اس نظم میں اس موضوع پر ایک ڈرامائی انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں ایک تمثیلی کیفیت ہے۔ شعری تاثر ہے۔ چاند ستاروں سے کہتا ہے:

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

کائنات کی بنیاد حرکت اور عمل پر ہے۔ انسان کی زندگی گردشِ پیہم، فکر و جستجو اور تڑپ کا نام ہے۔ اندیشۂ سود و زیاں موت کی علامت ہے۔ عملِ صالح کی بدولت حیاتِ جاوید حاصل ہوتی ہے۔ اقبال کے اکثر و بیشتر اشعار اتنے ہمہ گیر، معنی خیز اور مضمون آفریں ہیں کہ ان میں حیات و کائنات سے متعلق اہم سے اہم نکات ملتے ہیں۔ ذیل میں چند ایسے اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن میں اقبال کا فلسفۂ حیات جامعیت و معنویت کے ساتھ پایا جاتا ہے پیہم فکر و عمل، مسلسل جدوجہد، ہمت و استقلال، محنت و کاوش، خوشنا سی و خود اعتمادی کا کسی نہ کسی رُخ سے پیغام ضرور ملتا ہے:

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی — ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی
برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اُسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے — سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی